

نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسول

(حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں)

— نعیم صدیقی —

(۷)

امت کے لیے آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ ہونے کا منطقی تقاضا | خدا کا رسولؐ جب خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف مناصب پر مامور ہوا، اور وہ بالکل سرکاری حیثیت میں امت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار پایا ہو، یعنی اپنے قول و فعل سے اسے زندگی کے ہر ہر دائرے اور شعبے میں مثالی روش کو پیش کرنا ہو تو پھر یہ بات تو قرین قیاس نہیں رہتی کہ اس سے نمونہ لینا یا نہ لینا، اس کی تقلید کرنا یا نہ کرنا، اس سے کوبین و شریعت کا سبق سیکھنا یا نہ سیکھنا، اس کا دامن نظامِ کرہ حیات پر چھنا یا نہ چھنا مساوی ہوں۔ یعنی وہ اسوۂ حسنہ تو ہو، اور ہر پہلو سے ہو، لیکن اس سے استفادہ کرنا بالکل امرِ اختیاری قرار دیا جائے۔ وہ انسانی زندگی کے بارے میں قرآن کے احکام کی تفسیر و تعبیر اپنے عملی مظاہرہ سے کرے تو سہی، لیکن اس کو قبول کرنا محض ایک نفلی یا مستحب نوعیت کا عمل سمجھا جائے۔ وہ اگر اسوۂ حسنہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستند اسوۂ حسنہ ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بعد مطاع "ہو اور اس کی پیروی و اطاعت نظامِ نبی میں قطعاً طور پر لازم ٹھہرے۔ وہ جس چیز کا التزام کرے، اس میں ساری امت کے لیے التزام کرنا لازم ہو جائے۔ وہ جس چیز سے اجتناب کرے اس سے اجتناب کرنا ہر مسلمان پر واجب ٹھہرے۔ وہ جس چیز کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرے اس میں ہر مومن کے لیے پسندیدگی پیدا ہو جائے۔ وہ جس چیز سے کراہت کرتا ہو اس میں اللہ کے ہر بندے کے لیے کراہت پیدا ہو جائے۔ وہ جس سے کٹ جائے اس سے ساری امت کٹ جائے، اور وہ جس سے بڑے اسی سے ساری امت بڑے۔ وہ جدھر سے منہ موڑے اُدھر سے ساری قوم منہ موڑے اور وہ جدھر رخ کرے ساری قوم اُدھر رخ کرے۔ کسی عقیدے، اصول یا حکم کے مختلف تصورات میں سے جس کو وہ ترک کر دے وہ

دنیا بھر میں ہمیشہ کے لیے متروک ہو جائے اور جس تصور و تشریح کو وہ قطعیت سے اختیار کرے اُسے اس پر ہر بھر دہرے کرنے والا پورے تشریح صدر کے ساتھ اختیار کر لے۔ دوسرے لفظوں میں اسے بے چون و چرا اطاعت کا مستحق ہونا چاہیے۔ اس کا مقام لازماً دین کے نظام اطاعت کی ایک مستقل کڑی کا ہو گا جس کو بیچ میں سے نکالنے سے سلسلہ اطاعت قائم ہی نہ رہ سکے گا۔

رسولؐ کے اسوہ حسنہ ہونے کا یہ منطقی تقاضا کہ وہ نظام اطاعت کی ایک مستقل کڑی ہو، ٹھیک اسی طرح قرآن کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ قرآن رسولؐ کو اس حیثیت سے ایک جگہ نہیں، بار بار پیش کرتا ہے، اس معاملے میں اس درجہ تکرار و تصریف سے کام لیا گیا ہے کہ کسی استنباہ کی گنجائش رہتی ہی نہیں۔ کہنا یوں چاہیے کہ قرآن — پورے قرآن — نے آنحضرت صلعم کو صرف اسی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس معاملے کی مرکزی آیت سورہ نساء میں ہمارے سامنے آتی ہے اور ایسے سیاق و سباق میں آتی ہے کہ سلسلہ کلام کو سامنے رکھتے ہوئے صرف کوئی کندہ ناتراش ہی یہ گمان باندھ سکتا ہے کہ رسولؐ نے خدا کی کتاب پہنچائی اور اس پر اس کا کام ختم ہو گیا، امت کے لیے اُس کے پاس اور کچھ نہیں ہے، اور وہ اپنے اندر اور کسی لحاظ سے کوئی اتھارٹی نہیں رکھتا۔ سورج پر مٹی ڈالنے والا شخص اُس سے کم درجہ کا احمق ہو گا جو منصب رسالت کے بارے میں قرآن کے دئے ہوئے روشن اور واضح اور صریح تصورات کو خیالات پریشان کا خبار اڑا اڑا کر ڈھانپ دینا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اور کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کو مسح کریں اور اس کے ایک ایک لفظ سے لڑائی لڑیں۔

سرکاری گواہ | سورہ نساء اپنے نظام مطالب کے لحاظ سے اُن معرکہ آرا سورتوں میں سے ایک ہے جو اسلامی نظام تمدن و معاشرہ کے لیے اصول، اساسیات، قوانین، اخلاقی ہدایات اور ضروری مسائل فراہم کرتی ہیں چنانچہ مختلف سیاسی اور تمدنی اور معاشی احوال و لواہی کا بیان ہوتے ہوئے سلسلہ کلام ذیل کی ایک اہم حقیقت کو ابھار لاتا ہے:

فَلْيَفْ إِذَا جِئْنَا بِكُلِّ أُمَّةٍ لِّشَهِيدٍ وَجِئْنَا
بِلَيْعٍ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا ۗ يَوْمَئِذٍ لَّيُودُ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصُوا الرَّسُولَ لَوْ تَسْوَىٰ
بِهِمُ الْأَرْضُ ۗ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا

پھر کیا حال ہو گا اس وقت جب ہم ہر امت کے اندر سے
(خود اس کے بارے میں کوئی) گواہ اٹھا کر آئیں گے، اور
(اسے محمد صلعم) ان لوگوں پر آپ کو شہادت کے لیے طلب
کریں گے۔ اُس دن وہ لوگ جنہوں نے انکار کی روش اختیار

کی ہوگی، اور جنہوں نے رسولؐ کی نافرمانی کی ہوگی، یہ آرزو

کریں گے کہ کاش کہ ان کو مٹی میں ملا دیا جائے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ

سے (حقیقت حال کے بارے میں) کوئی بات چھپانہ سکیں گے۔

مراذیہ ہے کہ یہی رسولؐ جو آج تم کو ایک نظامِ خیر و برکت کا درس دے رہا ہے جو تمہارے سامنے خیر و فلاح کی راہیں کھول رہا ہے، اور جو محض ہندلال سے حق کو تمہارے سامنے رکھ رہا ہے اور تمہارے دلوں میں زبردستی اپنی تعلیم کو نہیں اتار سکتا، جس کا تم مذاق اڑاتے ہو، جس سے تم بھٹتے ہو، جس کا ڈٹ کر انکار کرتے ہو، جس کی خیر خواہی کا جو اب غصے اور نفرت سے دیتے ہو جس کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہو، اور پھر نفاق کی نقاب اور ڈھکڑھکڑ کی دھوپر ایمان لانے کے اقرار کے بعد پھر جس کی نافرمانی کرتے ہو، جس کی اتھاڑی کے آگے سرِ اطاعت خم نہیں کر کے دیتے، یہی رسولؐ کل عدالتِ آخرت میں ان تمام واقعات و احوال کا سرکاری گواہ بن کے کھڑا ہوگا اور وہ اپنی شہادت دیتے ہوئے ایک طرف یہ واضح کرے گا کہ اس نے ہدایت کو پہنچانے میں دینِ حق کا پیغام سنانے میں، ایک پاکیزہ معاشرہ کے قیام میں منشاء اللہ کی تشریح و توضیح میں، احکامِ صمدی کے مطابق عملی نمونہ پیش کرنے میں اپنی سی کوشش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی، اور دوسری طرف وہ تمہارے کرتوتوں کے پول کھولے گا کہ کس نے ایمان کا ثبوت دیا اور کس نے انکار کی روش اختیار کی، کس نے خدا کو مانا تو اس کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت بھی کی اور کس نے رسولؐ کی نافرمانی میں اپنی عاقبت کو برباد کیا۔

رسول اللہؐ کی یہ گواہ ہونے کی حیثیت دو گونہ ہے: ایک طرف آپ بندوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی جانب سے

اس حقیقتِ غیبی کے گواہ ہیں جس کو زندگی کی اساس بنانے ہی میں ساری خیر و فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف آپ اپنی مخاطب قوم اور اپنی پیرو امت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی عدالتِ محاسبہ میں گواہ بنا کے کھڑے کیے جائیں گے کہ اس قوم اور اس امت نے خدا کے دین کا استقبال کس طرح کیا اور خود رسولؐ کے احکام اور اسوہ کے ساتھ کیا روش اختیار کی؟ یہ منصبِ شہادت خود بتاتا ہے کہ جملہ انبیاء و رسل کی طرح آنحضرتؐ نظامِ دینی میں ایک اہم اتھاڑی میں۔ آپؐ نے سے قاصد نہیں کہ وہی کار لیکار ڈنسا دیں، بلکہ آپ کے ذمے چونکہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر اور اسلامی ریاست کو عملاً بر روئے کار لانے اور ایک صالح امت اور ایک پاکیزہ سوسائٹی کو استوار کرنے کا فریضہ ہے جس میں آپ کو پوری پوری

نگاہ رکھنی ہے کہ مخاطبین آپ کی دعوت پر کیا رد عمل دکھاتے ہیں، آپ کے پیغام کا کیا جواب دیتے ہیں، آپ کی امت آپ کی تعلیم کو کس حد تک جذب کرتی ہے۔ آپ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے والے اپنے دعوے کو کس حد تک نبھاتے ہیں۔ آپ کا پیش کردہ نمونہ کہاں تک اختیار کیا جاتا ہے؟ یہ اتھارٹی ایک مہارت کی اتھارٹی ہے۔ یہ ذمہ داری ایک ناظم اجتماعیت کی ذمہ داری ہے، یہ منصب ایک مکمل لیڈر کا منصب ہے۔ یہ کچھ اس نوعیت کا عہدہ ہے کہ جیسے ایک بادشاہ کا بھیجا ہوا نائب اس کی کسی نوآبادی میں رعایا کے سامنے بادشاہ کی مرضیات کا نمونہ دگواہ ہو اور دوسری طرف خود بادشاہ کے سامنے وہ رعایا کے طرز عمل کے بارے میں اپنی رپورٹوں کے ذریعے شہادت حق پیش کرنے والا ہو۔ پھر اگر اس رعایا کے مختلف افراد و عناصر کے عاصیہ کی گھڑی آجائے اور وفاداروں اور باغیوں اور فتنہ گردوں اور چھپے غداروں کے اعمال کی جانچ پڑتال کے لیے خود بادشاہ کی اپنی تحقیقاتی عدالت کا رروائی شروع کرے تو ہر مقدمے میں سب سے اہم شہادت بادشاہ کے نائب کی ہوگی جو سرکاری اتھارٹی کے ساتھ گواہوں کے کٹہرے میں آئے گا اور اس کی دعوت اور تعلیم کا جس جس تے جو جو جواب پیش کیا ہوگا اسے بھی سامنے رکھ دے گا اور خود اس نائب کے احکام اور اس کی دی ہوئی ہدایات میں فرماں برداری اور نافرمانی کی جیسی جیسی روش کسی نے دکھائی ہوگی اس کی رپورٹ بھی پیش کرے گا، اور اس کے فائیم کردہ اسوہ اور نمونہ اور نظیر کو جیسی جیسی وقت کسی نے دی ہوگی اس کا حال بھی بلا کم و کاست وہ پیش کرے گا۔

مذکورہ بالا آیت صراحت کرتی ہے کہ رسول اللہ کی شہادت جن لوگوں کے خلاف پڑے گی ان پر دو چیزوں کی دہرے سے گرفت ہوگی: ایک خدا کے دین کے خلاف کفر و انکار کی روش، دوسرے رسول کی نافرمانی! یہ شہادت جس کے خلاف پڑے گی وہ اس وقت کوئی راہ نجات نہ پا کر یہ کہے گا کہ کاش کہ میں انسان نہ ہوتا اور مٹی میں ملا دیا گیا ہوتا۔ یہاں غور کیجیے تو ”عَصُوا الرَّسُولَ“ کے الفاظ بڑے اہم ہیں۔ نہیں کہا کہ اللہ کی نافرمانی کی تھی کیونکہ اس کا مفہوم ”کفر“ میں ادا ہو چکا نہیں کہا کہ قرآن سے روگردانی کی، بلکہ نہایت کھلے لفظوں میں کہا تو یہ کہا کہ ”رسول کی نافرمانی کی“ آخر منصب رسالت میں کوئی اتھارٹی تھی تو زور دے کر رسول کی نافرمانی کا ذکر کیا گیا۔

یہود کی مگر اسی کا راز اس کے بعد پھر کچھ احکام و ہدایات بیان ہوتے ہیں، اور لیکاریک بیچ میں اس مفسد گروہ کا ذکر آتا ہے جو اللہ کی کتاب پالینے کے بعد ضلالت کے گاہک بنے اور خود تو گمراہ تھے ہی، اسکا انوں کو بھی الفاظ کتاب

کھینٹا کھاتے تھے اور راہِ حق سے مٹا لے جانے کی کوشش میں دن رات سرگرم تھے۔ یعنی یہود! ان لوگوں کی گمراہی کا راز کیا تھا؟ جواب دیا جاتا ہے کہ ”يُحْتَرِقُونَ الْكَلِمَةَ عَنْ مَوَاضِعِهِ“ (النساء - آیت ۴) یعنی الفاظ کو ان کے حقیقی محلِ استعمال اور ان کے سیدھے صاف مفہوم سے ہٹا کر کہیں کا کہیں لے جاتے ہیں۔ کتابِ الہی کے الفاظ سے کھیلنے کی یہ چھوٹ ان کو اس لیے ملی کہ ان کے ہاں اموۃ انبیاء کی مشعلِ گل ہو چکی تھی اور صراطِ مستقیم کے جو نشانات خدا کے رسولوں کی عملی زندگی نے نصب کیے تھے اور فہمِ کتاب کے جو رنگ و میل وہ کھڑے کر گئے تھے وہ امتدادِ زمانہ اور یہود کی لاپرواہیوں کی وجہ سے — مٹ مٹا گئے۔ اب جب الفاظِ کتاب سے سنتِ انبیاء کا پہرہ اٹو گیا تو ان کے ساتھ تاویل کا کھیل کھیلنا آسان تھا۔ جس مفہوم کو یہود کے پادریوں نے چاہا الفاظِ کتاب سے نکال باہر کیا اور جس ماڈرن مفہوم کو چاہا داخل کر دیا۔ بات یہیں تک نہیں رہی، معنی کی یہ تحریف بالآخر خود الفاظ کی تحریف پر منتج ہو کے رہی۔

یہود کے اس ذہنی بگاڑ کی تازہ ترین شہادت کو قرآن نے مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا کہ دیکھ لو، ان کا حال کیا ہے ان کی تصویر یہ کھینچی گئی کہ وہ مسلمانوں کے جمعوں میں آکر بیٹھتے ہیں، نبی صلعم کے خطابات کو سنتے ہیں اور پھر سیدھی طرح سمعنا و اطعنا کہنے کے بجائے مسخرے پن کے ساتھ ”سمعنا و عصینا“ اس طرح کہتے ہیں کہ ایک طرف تو آس پاس بیٹھنے والوں کی نگاہ میں رسول اللہ کے کلام کی سبکی ہو، دوسری طرف اگر کوئی مسلمان گرفت کرے تو دو متضاد کلموں کی آواز کی مشابہت کے پردے میں اپنا جرم یہ کہہ کر چھپا سکیں کہ صاحبِ ایم نے تو ”اطعنا“ کہا تھا آپ کو سہو ہوا کہ آپ نے ”عصینا“ سمجھا! اسی طرح وہ ”وَأَسْمَخْ غَيْرَ مَسْمُوحٍ“ کا جملہ بولنے کے جس کے دو مفہوم تھے، بظاہر یہ کہ حضور! ذرا سنیے! خدا کرے آپ کی بات کو کوئی رد کرنے والا نہ ہو“ اور باطن یہ کہ ”سنیے، خدا کرے کہ آپ کچھ نہ سن پائیں“۔ اس سے مطلوب یہ تھا کہ رسول اللہ صلعم کا مذاق اڑے اور مسلمانوں میں بے وقری ہو، لیکن اگر کوئی ٹوکے تو کہہ دیا جائے کہ صاحب، یہ تو ہم ایک اچھی دعا کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مجالس میں بیٹھ کر آنحضورؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ”راعنا“ یعنی ”ذرا ہماری طرف توجہ فرمائیے“! حالانکہ اس کا دوسرا نمایاں مفہوم یہ بھی تھا کہ اے ہمارے چرہا ہے! یہاں بھی اس دورنگی کلام سے مقصود یہ ہونا تھا کہ آنحضور صلعم کے خلاف تمسخر و اتہام کی ایک نصاب برپا ہو، لیکن کسی طرف سے گرفت ہو تو اچھے مفہوم کو سامنے رکھ کر کہا جائے کہ واہ جناب، آپ نے ہمیں اتنا معقول آدمی سمجھا ہے کہ اتنی غیر شرعیانہ بات

ہم کہہ سکتے ہیں!

اس تازہ شہادت سے ایک طرف ان حالات پر تبصرہ ہو جاتا ہے جن سے آنحضرت اور مسلمان گذر رہے تھے، اور دوسری طرف یہ حقیقت ان کے ذریعے کھل جاتی ہے کہ جو امت رسولوں کے اسوہ کی شمع گلی کر بیٹھتی ہے وہ پھر کتاب کے الفاظ سے جو مذاق چاہے روا رکھتی ہے۔ نیز جن لوگوں کے اندر رسول کا احترام موجود نہ ہو اور وہ اس کی اتھارٹی پر اعتماد نہ رکھتے ہوں تو پھر سرے سے وحی اور ہدایت اور دین اور قانون کا بھی کوئی وقار باقی نہیں رہ جاتا۔

اس آیت ۴۶ کے بعد آیت ۴۷ میں مسلمانوں کو سخت انتباہ دیا ہے کہ خبردار ایسی روش اختیار نہ کرنا کہ تم بھی ان لوگوں کی طرح لعنت زدہ ہو کر رہ جاؤ۔ پھر اشارہ کیا ہے۔ یہود کے اس گروہ کی طرف جسے قرآن نے اصحابِ سبت کا نام لعیب دیا ہے۔ یہ وہ گروہ تھا جس نے خدا کے ایک حکم کے الفاظ تو خدا کے نبی سے ٹھیک وہی لے لیے جو وحی بن کر آئے تھے، لیکن ان الفاظ کا عمل مفہوم نبی کے اسوہ سے قبول کرنے کے بجائے ان کو آزادانہ و بیلاط کا کھلونا بنا لیا۔ خدا کا حکم مذاق بن کے رہ گیا، کیونکہ لفظ ہر حکم پورا بھی ہو رہا تھا اور مچھلیاں بھی دل کھول کر پکڑی جا رہی تھیں۔ مسلمانوں کو اشارات میں یہاں یہ درس دیا گیا ہے کہ اگر تم نے بھی اسی طرح الفاظ کو رسول کے اسوہ سے الگ کر کے لیا اور ان سے کھیلنے پر اتارنے لیا تو انجام کو پہنچو گے جس تک اصحابِ سبت اور ان کے پیوکار پہنچے ہیں۔

یہ وہ اصل وجہ فساد ہے جس کے زیر اثر ایک طرف تو یہود کو یہ سعادت مل کہ "أُولَئِكَ نَصِيبًا مِّنَ الْكُتُبِ" (آیت ۵۱) یعنی اللہ تعالیٰ کے وحی کردہ نوحہ سے ان کا دامن مال لال ہوا، دوسری طرف یہ سچی کہ "بِوَحْيِنَا بِالْحَبِيبِ وَالطَّاعُونَ" یعنی نبیوں کی پوجا ہے اور شیطان کی مریدی ہے۔ رسالت کو کتاب کے فہم میں اتھارٹی نہ ماننے اور الفاظ میں سے من مانے معنی تلاش کرنے کی آزادی کا نتیجہ یہی تو ہو سکتا ہے۔

اسلامی نظام کے دو تقاضے | اب ہم اس مرکزی آیت کے قریب تر آگئے ہیں جو ہمارے استدلال کی تعمیر کا کونے کا پتھر ہے۔ نساؤ کی آیت ۵۵ میں یہود کے اس قومی جذبہ حسد کی طرف اشارہ ہے جو امت مسلمہ کے لیے ان کے دلوں میں کار فرما تھا۔ اور اس کی وجہ بھی تبادی کہ "فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مَثَلًا عَظِيمًا" یعنی ہم نے ابراہیمؑ کے خاندان کے کو اپنی انامی ہدایت سے، اس پر کار بند ہونے کے لیے نبی صلعم کی پیش کردہ حکمت سے ماہر پھر اس کے مطابق ایک اجتماعی نظام تعمیر کرنے کے لیے عظیم الشان سلطنت سے نوازا ہے۔ جتنا اس مسئلہ

میں بتایا جاتا ہے کہ جس دعوت کے ذریعہ یہ نعمتیں دی جا رہی ہیں ایک گروہ اُس پر ایمان لانے والوں کا ہے، دوسرا گروہ اس کی راہ روکنے والوں کا ہے۔ پھر دونوں کا انجام بیان ہوا ہے (آیت ۵۵، ۵۶، ۵۷) اب سلسلہ کلام ہمیں یہاں لے آتا ہے کہ عظیم الشان سلطنت کی صورت میں کتاب و حکمت کی بنیاد پر جو نظام اجتماعی استوار کیا جا رہا ہے اس کے دو اصولی تقاضے کون سے ہیں کہ جن کے بغیر یہ ایک دن نہیں چل سکتا۔ فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ
إِلَىٰ أَهْلِهَا لَا فَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ
أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ط

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانات (بالخصوص قیادت اور اقتدار کی امانت) کو ان کے حقداروں کو سونپو، اور جب تم لوگوں کے درمیان معاملات چکانے کے لیے (عدالت کی کرسی پر) بیٹھو تو انصاف کے ساتھ فیصلے کرو۔

(النساء - ۵۸)

عظیم الشان سلطنت پر گفتگو کرتے ہوئے موقع کا جو کچھ تقاضا تھا وہی اس آیت سے پورا ہوتا ہے۔ یعنی اسلامی نظام حیات کے دو امتیازی پہلو حکیمانہ انذار کے ساتھ بیان کر دئے گئے ایک ادائے امانت، دوسرا انصاف سے معاملات طے کرنا۔ ادائے امانت اور انصاف سے معاملات کو چکانا یوں تو اپنے اخلاقی مفہوم کے لحاظ سے زندگی کے جزئی سے جزئی معاملے تک وسیع ہیں، لیکن سلسلہ گفتگو کے لحاظ سے اس مفہوم کو خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے اجتماعی نظم کے خاص تقاضوں کو، یعنی ایک یہ کہ مناصب اقتدار کو بہ حیثیت مقدس امانت کے ہمیشہ اہل لوگوں کے حوالے کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر جو لوگ معاملات کا تصفیہ کرنے کی ذمہ داری سر لیں وہ اصول عدل کو شمع راہ بنائیں۔ ایک طرف صالح قیادت ہو، دوسری طرف صالح اصول ہوں تو جب ایک صالح معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور ایک اسلامی سلطنت چل سکتی ہے۔

اسلامی ریاست کا نظام سمع و طاعت | یہ اشارات دینے کے بعد اب قرآن واضح کرتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کس نظام سمع و طاعت پر چلتا ہے۔ نظام سمع و طاعت کسی بھی نظام کی ریڑھ کی ٹڈی ہوتا ہے۔ اور یہی دنیا کی سب سے ریاست اور معاشرہ اس کو تعین سے بالعموم اپنے دستور اساسی میں بیان کر دیتا ہے۔ ٹھیک اسی اہمیت کے ساتھ قرآن نے اسلامی نظام طاعت کے مراتب کو ایک دینی اصول کی حیثیت سے بھی، اور ایک دستوری دفعہ کی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس معاملے میں پیش نظر آیت اتنی اہم ہے کہ ہمارے ہاں یہ بڑی وسیع دستوری بحثوں کا

مرکز و محور قرار پائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ!

اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو
رسول کی، اور ان کی بھی جو تم میں سے معاملات کی باگدور

سنجالنے والے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے، من کر چکے ہیں سلسلہ کلام گواہ ہے کہ اجتماعی نظام کے مسائل زیر بحث ہیں اور اسلامی معاشرہ کی ضروریات ہیں کہ جن پر گفتگو ہو رہی ہے، گویا پورے کا پورا دین، پورے کے پورے شعبہ ہائے حیات، پورے کے پورے انسانی معاملات ہیں کہ جن کے بارے میں یہ حقیقت واضح کرنا مقصود ہے کہ کام کس نظام طاعت پر چلنا ہے اور کون کیا اتھارٹی رکھتا ہے۔

تین مراتبِ اطاعت | اس آیت کو سیدھے سادے طریق سے پڑھیے، سیدھے سادے طریق سے اس کا ترجمہ کیجئے کسی نکتہ طرزی اور کسی منطق آرائی کی ضرورت نہیں۔ کسی ادبی بیج کا موقح نہیں، کسی الحجاء اور سلجھاؤ کا مقام نہیں، بات بالکل صاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "اطاعت کو اللہ کی، پھر کہا جاتا ہے کہ اطاعت کرو رسول کی"، اور آخر میں کہا جاتا ہے کہ اطاعت کرو اپنے اہل امر کی۔ فوراً پہلا سوال یہ اٹھ کھڑا ہو گا کہ اس آیت میں مراتبِ اطاعت کتنے ہیں؟ ایک صاف سٹھرا ذہن جب بھی اس سوال کا جواب خود آیت سے مانگے گا تو اسے معلوم ہو گا کہ مراتبِ اطاعت تین ہیں، لیکن وہ اگر سوال کا جواب دریافت کرے گا منکرینِ حدیث سے، تو وہ بتائیں گے کہ مراتبِ طاعت دو ہیں! وہ پوچھے گا کہ حضرت، ان تین چیزیں کونسی ریاضی کی رو سے دو ہوجاتی ہیں؟ اس پر ان کو بتایا جائے گا کہ حدیث کا انکار کرنے سے وہ ریاضی آدمی پر منکشف ہوتی ہے جس کا نام مولایہ ہے کہ تین برابر ہوتے ہیں دو کے (۳ = ۲)۔ مسائل مزید پریشانی کا اظہار کرے گا تو اسے پہلے تو ملاؤں کے خلاف مغلفات کا ایک ڈوز پلایا جائے گا، پھر احادیث کے خلاف ایک تقریر کانوں میں ٹھونسی جائے گی اور پھر جب اس بچارے کا سر بالکل چکر اچاٹے گا تو اسے تفسیری نکات یوں بتائے جائیں گے کہ خدا کی اطاعت تو ہوئی خدا کی اطاعت، یعنی قرآن پر کاربند ہونا۔ اس کے بعد آئی رسول کی اطاعت، سورسول تو خود قرآن ہی کا چاند اور قرآن ہی کو پیش کرنے والا ہے۔ لہذا رسول کی اطاعت سے مراد بھی وہی پہلی چیز ہوئی کہ خدا کی اطاعت کی جائے اور قرآن کا دامن تھاما جائے۔ رہی اگلی چیز تو عملاً اسلامی ریاست کے کارپردازوں کی اطاعت

کئے بغیر تو اجتماعی نظام چلتا نہیں۔ پس اطاعتیں دو ہی تحقیق ہوئیں، ایک اللہ (قرآن) کی اطاعت، دوسری حکومت و
(پارلیمنٹ) کی اطاعت! اللہ اللہ خیر سلا! رسول بیچ میں سے صاف غائب۔

ملاحظہ فرمائیے، وہی یہود و الافنادِ ذہین، کہ رسول کا دامن چھوڑا، اس کی سنت اور اس کے اسوہ کی اہمیت نگاہ
بہی تو اس کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر الفاظِ کتاب سے کھیل شروع ہو گیا، اور مسخ و تحریف کی ایسی بدیہی مثالیں
پیدا ہوتے لگیں، بلکہ چھاپ چھاپ کر پھیلائی جانے لگیں! ان مفسرین قرآن سے کوئی پوچھے کہ ایسے اہم موقع کلام پر
نظام اسلامی کی ریڑھ کی ہڈی کے طور پر ایک حقیقت بیان کرتے ہوئے قرآن سے ایسے گنجلک اسلوبِ گفتگو کی توقع
کی جاسکتی ہے کہ مراتبِ اطاعت ہوں تو دو، لیکن وہ تین بن کے سامنے آئیں اور ان کو پھر دو کی شکل میں لانے کے لیے
عظیم الشان ہیر پھیر کرنا لازم ہو جائے، اور اسی ہیر پھیر کے لیے امت تیرہ صدیوں تک ایک مستقل گروہ کے انتظار میں
ٹامک ٹویسے مارتی رہے۔ بات یوں کہی جاسکتی تھی کہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الامر منکم یا اطیعوا القرآن و
اطیعوا الامر منکم، لیکن یہ صاف صاف طریقہ چھوڑ کر قرآن کا معیارِ فصاحت و بلاغت ایسا بیان اختیار کرنا ہے
کہ جس میں "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کو "اطیعوا اللہ" کے ہم معنی قرار دینا پڑتا ہے اور اس کے لیے قرآن پر
بڑی معرفت آرائی کی ضرورت پیش آئی ہے۔

لیکن کیا کل یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اپنی مفسرانہ ذہانت کا یوں مظاہرہ کرے کہ "اطیعوا الامر" کی اطاعت بھی
مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کے لیے لہذا آیت کا مطالبہ صرف ایک ہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے۔
باقی رسول جاچکا اور اطیعوا اللہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے، لہذا مرتبہ اطاعت صرف ایک ہی اس آیت میں
بیان ہوا ہے۔ دوسرے دو تو یونہی ایک زینتِ کلام ہیں۔

اس ماڈرن قسم کی معرفت قرآنی کی بھول بھدیاں سے نکل آئیے تو تینوں مراتبِ اطاعت نکھر کر سامنے آجاتے ہیں،
اور ان کے بارے میں آیت کو سیدھے سادے طریق سے پڑھنے میں ذرہ بھرا تکال نہیں پیدا ہوتا۔ ہم ان مراتب کو
الگ الگ لیتے ہیں۔

۱۔ خدا کی اطاعت | آیت میں "اطیعوا اللہ" کے الفاظ فی الواقع اس اہل اطاعت کو پیش کرتے ہیں جو کسی دوسری
اطاعت کا تقاضا بن کے نہیں، بلکہ بجائے خود ایک تقاضا بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ اطاعت اس تعلق پر مبنی ہے، جو

خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ جس خدا نے پیدا کیا، جس کی دی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ زندگی لہجرتی ہے جس کے رزق پر بندے پلتے ہیں، جس کی ہدایت کے نور سے فوز و فلاح کے راستے پاتے ہیں، وہ آپ سے آپ حق رکھتا ہے کہ بندوں سے اطاعت کا مطالبہ کرے اور بندوں پر بلازم آتا ہے کہ وہ بندے ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت کریں۔ اس لحاظ سے یہ اہل اطاعت ہے کہ ہر دوسری اطاعت کو اس کے اوپر مبنی ہونا چاہیے، اس کے تحت ہونا چاہیے، اور اس کے تقاضا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر واجب ہونا چاہیے۔

یہ اطاعت واحد صاحبِ حاکمیت (SOVEREIGN) ہستی کے مالک الملک اور آمر مطلق ہونے کا تقاضا ہے۔ اس اطاعت کی حدود مقرر کرنے والا وہ خود ہے، کوئی دوسرا نہیں، اس کے دائرہ کی وسعتوں کا تعین کرنے والا تنہا وہی ہے، اسی کا امر اور اسی کا حکم آخری معیار اور آخری سند ہے۔ کوئی دوسری کوئی نہیں جو اس کی مرضیات اور اس کے احکام اور اس کی ہدایات کے قابل قبول ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے، اس کی مرضی ہی واحد کوئی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کسی اور کے لیے اطاعت نہیں ہے، کیونکہ اپنے کسی حق کی بنا پر کوئی اور اطاعت کا استحقاق نہیں رکھتا۔

۲۔ رسول کی اطاعت | خدا مادیت و بشریت سے ایک منزہ ہستی ہے، لہذا اس امر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خود تشریح کی بندگیوں سے اترے اور تجسم کی مادی پستی میں نمودار ہو، وہ انسانی زندگی کے معاملات میں ایک عملی رہنما بن کے چلے اور پھر سوسائٹی سے مطالبہ کرے کہ سب لوگ میرے نقش قدم پر چلیں۔ وہ آدمیوں میں آدمیوں کی طرح رہ کر دکھائے کہ اسے کیا طرز عمل مطلوب ہے۔ وہ کاروبار کرے اور کاروباروں کے لیے نمونہ بنے۔ وہ خاندانی زندگی کا قوام ہو اور قوامین کے لیے طرز عمل متعین کرے، وہ کسی کا باپ ہو اور آپوت کا صحیح مسلک سامنے لائے، وہ کسی کا بیٹا ہو اور شانِ فرزندگی کی مثال قائم کرے، وہ کسی کا آقا اور کسی کا غلام ہو اور آقائی و غلامی کا بہترین اسلوب پیش کرے، وہ معلم، متعلم، حاکم، سپہ سالار اور زوج بن کر مختلف فرائض انجام دے اور ان فرائض کی ادائیگی کے لیے دوسروں کو عملی روشنی بہم پہنچا دے۔ نوعِ انسانی کی یہ ضرورت کہ وہ انسانوں ہی کے ذریعے زندگی کا سبق لے سکتی ہے، اس کی مقتضی ہوئی کہ اس کے اندر سے انسانوں ہی کو اس کی اصلاح و تعمیر کے لیے اٹھایا جائے۔ چنانچہ عملی نمونہ پیش کرنا تو الگ رہا، اللہ تعالیٰ کے تو براہِ راست جملہ افرادِ انسانی سے کلام بھی نہیں فرمایا، براہِ راست تو وحی بھی نہیں اتاری، براہِ راست قرآن بھی پیش نہیں کیا۔ قرآن بھی اتارا تو بیچ میں ایک پیکرِ انسانی کو واسطہ بنا کر اتارا۔ خود اس منتخب روزگار پیکرِ انسانی کو بھی

قرآن اپنے ایک فرشتہ امین کے ذریعے عطا فرمایا۔ اُس نے انسانوں کے اندر سے ہر دور میں خود انسان ہی منصب نبوت و رسالت کے لیے چُنے اور پھر ان کو اتھارٹی دے کر بندوں سے مطالبہ کیا کہ میری اطاعت کرو، اور اس طرح کرو کہ یہ شخص تم سے جو کچھ کہے اس کی اطاعت کرو۔ یہ ہمارا مستند نمائندہ و ترجمان ہے! یہ ہمارے احکام کا پہنچانے والا بھی ہے اور ان کا مستقل شارح اور مفسر بھی! یہ تعلیم دینے والا بھی ہے اور عملاً اس تعلیم کے مطابق ہر پہلو سے نمونہ پیش کرنے والا بھی۔ پس رسول اس معنی میں اطاعت کا مستحق ہے کہ وہ جس جس چیز کا حکم دیتا ہے اسے وہ جس جس سے روکتا ہے اس سے روکتا ہے اور اس کی اطاعت کرتے ہوئے حکم دیتا اور روکتا ہے۔ اور پھر اللہ کی اطاعت کرانے کے لیے حکم دیتا اور روکتا ہے۔ یہ دوسری اطاعت پہلی اطاعت کو اختیار کرنے کا عملی ذریعہ ہے۔ یہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے ترجمان یا تاج کے نمائندے کی اطاعت ہے کہ جو ہر قول اور اقدام میں سرکاری پالیسی کا پابند۔ اور اس کا شارح ہے۔ رسول جب نمائندہ تاج اور ترجمان شاہی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو شاہی ہدایت و نگرانی کے تحت وہ ایک ایسی عظیم اتھارٹی سے سرفراز ہو جاتا ہے کہ جو گروہ وہ ڈال دے اسے کھولنے کا اختیار کسی کے لیے نہیں رہتا۔ اور جس گروہ کو وہ کھول دے اسے ڈالنے کا مجاز اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ جدھر چلے گا ساری خدائی کو ادھر چلنا ہوگا اور وہ جدھر سے قدم روکے گا ادھر سے پورے نظام حیات کے قدم رک جائیں گے۔ اس کی مہر جس تحریر پر ثبت ہو گئی اس کا ایک ایک حرف اہل ہو جائے گا، اور اس کے دربار سے جو فرشتہ مسترد ہو گیا اسے کہیں قبولیت نہ ملے گی۔

وہ لوگ جو زورِ ادب کے ساتھ استدلال کی ہوا باندھ کے ہم سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں "اطیعوا الرسول" کا مطالبہ سوائے قرآن کے اور کسی چیز کی اطاعت کو شامل نہیں ہے تو لید! وہ یہ رازِ سرسبز بھی تو کھول دیں کہ پھر "اطیعوا اللہ" میں قرآن سے بالا تر اور قرآن کے علاوہ کوئی چیز ہے کہ جس کے لیے مطالبہ اطاعت کیا گیا ہے۔ کیا یہ محض لفظوں کا اسراف ہے؟ ہاں، ہم ان سے خدا کا واسطہ دلا کر پوچھتے ہیں کہ اپنی خالص قرآنی فکر کے ساتھ وہ منطق، نحو، ادب، بلاغت وغیرہ کے سارے قواعد میں اجتہاد کر کے اس رمز کا بھی تو انکشاف فرمادیں کہ اگر "اطیعوا اللہ" اور "اطیعوا الرسول" دو ہم معنی کلمات ہیں تو کیوں ایسا ہوا کہ "اطیعوا اللہ والرسول" وہ اسلوب بیان یہاں اختیار نہ کیا گیا۔ جو دوسری جگہوں پر آتا ہے اہد جس میں تاویل بازی کے دروازے کچھ نہ کچھ کھلے رہتے ہیں۔ یہ دوسری بات "اطیعوا" کا ہے کہ لیسے ہے۔ اطاعت کا ایک ہی مرتبہ جب بیان ہو رہا ہو تو "اطاعت کرو" "اطاعت کرو" کو دوبارہ کہنے کی کوئی نیچہ؟

”اطاعت کرو، اللہ کی“ کہنے کے بعد یہ کہا جاتا کہ ”اطاعت کرو رسول کی“ گواہ ہے اس بات پر کہ اولین مرتبہ اطاعت کا بیان ختم ہوا اور اس کے بعد دوسرے مرتبہ اطاعت کا بیان شروع ہوا اور اس طرح دونوں مراتب الگ الگ نمایاں ہو گئے۔ ایک امر کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا اور ہر باب کے لیے نفل کا استعمال بالکل الگ مستقل طور پر کیا گیا اور یہ اہتمام اس لیے ہے کہ عمل نفل کو اسلام کے نظام اطاعت کی کڑیوں کو بیان کرنے کا تھا اور ہمیں اگر فتنہ کے لیے راستے کھلے چھوڑ دئے جاتے تو دوسرے مقام پر تو پھر منشاء قرآنی کی بالکل ہی خیر نہ تھی! اس سے بڑا کندہ ناتراش کون ہوگا جو یہ کہے کہ یہ ایک ہی مرتبہ اطاعت ہے جسے دو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے سیدھے کان کو سیدھا ہاتھ سیدھے طریقے سے دگانا اور پھر سیدھے ہاتھ کو گردن کے گرد گھا کر سیدھے کان تک پہنچانا ”مسئزم“ کے ماڈرن ذہن کے لیے کوئی کارنامہ فصاحت ہو تو ہو غریب قرآن کی ادبیت ان بلندیوں تک کہاں پہنچ سکتی ہے!

اسلامی نظام میں معیار فیصلہ | یہ آیت ابھی ختم نہیں ہوئی، آگے چلتی ہے۔ ایک دینی اصول اور ایک دستوری دفعہ کی حیثیت

میں مسلمانوں کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ تمہاری فطرت میں داعیہ اختلاف موجود ہے، اور اس فطری داعیہ کے لیے کام کرنے کا میدان اجتماعی نظام میں اسلام کی طرف سے رکھا جا رہا ہے، لہذا تمہیں جب اختلافات سے سابقہ پیش آئے گا تو اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ دین و سیاست کے روزمرہ کے معاملات میں وہ معیار فیصلہ کیا ہوگا جس کے ذریعے اختلافات رفع کئے جاسکیں۔ بہر نظام حیات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور ہر نظام حیات اس کا جواب دیتا ہے۔ علم کے دائروں میں بھی ہر نظام کو ایک معیار فیصلہ دینا پڑتا ہے اور سیاست کے عمل میدان میں بھی! چنانچہ اجتماعی نظام کی ریڑھ کی ہڈی کو متعین کرنے والی اس دستوری آیت میں اسلام نے بھی اپنا معیار فیصلہ پیش کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ :-

فَاتَنَّا زَعَمَدًا فِي شَيْءٍ فَرَدَّوْهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔

پھر اگر ان تین مراتب اطاعت کے تحت زندگی کا نظم چلائے ہوئے کسی معاملے میں تمہارے اند نزاع واقع ہو تو اس معاملے کو

اللہ اور رسول کے سامنے لے جا کے رکھو!

یہاں پھر معیار فیصلہ کے طور پر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو پیش نہیں کیا گیا۔ تنہا قرآن کی طرف رجوع کرنے کا اشارہ نہیں کیا گیا، بلکہ صراحتاً کہا گیا ہے کہ اختلافات کے تصفیہ کے لیے اپنے معاملات خدا اور رسول کے سامنے رکھو۔ یعنی قرآن کے اصولیات معلوم کرو، اور رسول کے اسوہ سے ان کی شرح و تعبیر اخذ کرو۔ یہاں پھر فتنہ گرد ذہن یہ کہتا ہے کہ :-

اللہ + رسول = قرآن - یہی نہیں، بلکہ یہ بطلانِ قرآنی اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں کہ اللہ اور رسول کی علیٰ جانشین تو ہوتی ہے اسلامی حکومت، اور اسلامی حکومت کا دل و دماغ اور اس کا مرکز اعصاب ہوتی ہے "اسلامی پارلیمنٹ" لہذا اللہ اور رسول سے مراد ہوتی پارلیمنٹ، اور امر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جن معاملات میں اختلاف ہو، انہیں تم لوگ اپنے اپنے وقت کی پارلیمنٹوں کے سامنے رکھ دیا کرنا، وہی تمہارے لیے اللہ اور رسول ہوں گی۔ یہ ہے قرآنی منطق جو ملاؤں کے بگاڑے ہوئے دین کو اپنی اصل حالت میں لانے کے لیے مصروفِ کار ہے۔ ان مجتہدین روزگار سے کوئی بھی یہ دریافت کر کے تباہے کہ اگر پارلیمنٹ آخری معیارِ فیصلہ ہو تو خود اس پارلیمنٹ کے اندر فکر و نظر کے جو اختلاف نمودار ہوں گے، مخالف و موافق ہو دلائل سامنے آئیں گے، ان کے لیے معیارِ فیصلہ کیا چیز ہوگی؟ پارلیمنٹ کے خدا اور رسول کو بھی تو مشخص کر دیجئے۔ غالباً وہ صدر یا اسپیکر ہوگا، یا وزیر اعظم یا لیڈر آف دی ہاؤس؟ سبحان اللہ و بحمدہ! قرآن پر بڑے بڑے ظلم ہوئے مگر یہ نوازشات اس پر کب کسی نے کی تھیں، اس کتابِ مظلوم کے ساتھ بڑے بڑے مذاق کئے گئے، مگر ایسا شاندار مذاق کسی کو کہاں سوجھا ہوگا۔

اللہ اور رسول سے اختلاف کرنے کا حق نہیں | درحقیقت یہ معیارِ فیصلہ "مضمّن تو آیت کے اسی پہلے حصے میں ہے جس میں اللہ کی اطاعت کو اصلاً مطلوب بنا کر، اور رسول کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کے مستند فائدہ و ترجیحاً ہونے کی بنا پر واجب قرار دے کر پیش کیا ہے۔ پھر اسی معیارِ فیصلہ کو نمایاں کر کے الگ بیان کر دیا، اور اس طرح بیان کر دیا کہ یہ حقیقت از خود واضح ہوگی کہ:

— نظام اسلامی میں فطری داعیہ اختلاف کے کام کرنے کے لیے مناسب حد تک میدان کھلا ہے۔

— مسلمان باہم دگر اختلافات رکھ سکتے ہیں۔

— وہ اپنے اہل امر یعنی حکام کی آراء، فیصلوں، پالیسیوں اور اقدامات کے بارے میں بھی اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔

— ان اختلافات کو رفع کرنے کے لیے ان کے سامنے خدا کی کتاب اور رسول کی تعبیر و تبیین کو معیار رکھا گیا ہے۔

— خدا اور رسول جب معیارِ فیصلہ ہیں تو ان سے اختلاف کا حق کسی مسلمان کو نہیں۔

آیت کا معیارِ فیصلہ "کو سامنے لانے والا یہ حصہ ایک مضبوط شہادت ہے اس پر کہ خدا کی اطاعت مرتبہ اول پر اور رسول کی اطاعت مرتبہ دوم پر ایسی مستقل اور باہم دگر لازم و ملزوم ہیں کہ ان میں سے کسی کے دائرے میں بھی کسی مسلم کے لیے

چون و چرا اور اختلاف اور روگردانی کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔ اس فکر و تدبیر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت کا تقاضا اسلامی نظامِ اطاعت کے سلسلہ کے ایک ہم کڑی ہے اور اس کڑی کو نکال دیجئے تو پورا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

۳۔ اولی الامر کی اطاعت | آیت کا تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ مسلم سو سوائی میں اولی الامر کی طاعت کی جانی چاہیے۔ لیکن ایسے گھر سے اندازِ بلاغت کے ساتھ تیسرا مطالبہ آیت میں رکھا گیا ہے کہ اس کا مرتبہ ثالث خوب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے "اطیعوا" کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے کیا گیا، پھر اسی امر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دوسرا یا گیا، لیکن تیسری مرتبہ امر کو محذوف رکھ کر محض عطف سے کام لیا گیا۔ یہ اسلوب شہادت دینا ہے کہ اصلاً طاعتیں خود ہی جن پر دین کا دار و مدار ہے یعنی خدا کی طاعت، اور رسول کی طاعت! اولی الامر کی طاعت مرتبہ ثالث پر اس لیے لازم کی گئی کہ خدا اور رسول کا حکم اگر چل سکتا ہے اور اس حکم کے مطابق ایک اجتماعی ہئیت اگر تشکیل پاسکتی اور برقرار رہ سکتی ہے تو ایک نظامِ حکومت کے ذریعے ہی رہ سکتی ہے۔ اور حکومت چلانے کے لیے نہ خدا تعالیٰ کو خود آ کے کام کرنا ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تنہا ہونے کے آئے تھے، بلکہ خود اپنے دور میں بھی انھوں نے کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ حکومت کے تمام مناصب پر بیک وقت خود ہی متمکن ہو کر خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے لے کر چہرہ اسی اور ہر کار سے تک کے کام خود ہی کڑا لیں۔ ناگزیر تھا کہ دستوری حیثیت کا اولی الامر کو اسلامی نظام کے سلسلہ اطاعت کی ایک کڑی کی حیثیت دی جاتی، اور وہ دی گئی۔

مراتبِ اطاعت کی وہ ترتیب جو آیت میں سامنے آئی ہے پہلی دو طاعتوں کو اصل قرار دینے کی وجہ سے از خود یہ فیصلہ بھی کر دیتی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کا دائرہ وہاں ختم ہو جاتا ہے جہاں وہ خود اللہ اور رسول کی طاعت تک محدود نہ جاؤ کریں۔ لفظ منکم مزید صراحت کرتا ہے کہ اولی الامر ہونے ہی وہ چاہیں جو تم میں سے ہوں، یعنی اسی اصولِ اسی ایمان، اسی فکر، اور اسی نظامِ طاعت کے نائل ہوں جس کے تم ہو۔ پھر معیارِ فیصلہ کے طور پر خدا و رسول کو جب سامنے رکھ دیا تو اولی الامر پابند ہو گئے کہ اپنے ہر فیصلے اور اقدام میں خدا و رسول کی تعلیمات کے آگے تسلیم کر دیں۔

رسولؐ بہ حیثیتِ اولی الامر کے | تین مراتبِ اطاعت کو دو میں بدلنے والا زرخیز ذہن جہاں اطاعتِ رسول کو اطاعتِ خدا میں گم کر کے مغالطے میں ڈالتا ہے، وہاں وہ دوسری تاویل کے ذریعے اطاعتِ رسول کو اطاعت کے ساتھ بھی جاملاتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ رسولؐ کو وہ پہلے دو حصوں میں بانٹتا ہے، ایک رسالت، دوسری امارت۔ پھر یہ حیثیت رسولؐ تو وہ اس کو خدا کی طرف ملا دیتا ہے اور بہ حیثیتِ امیر وہ اسے وقت کے کارپردازانِ حکومت کے زمرے میں ڈال دیتا ہے

بہ حال سلسلہ طاعت کی ایک بڑی اسے گم منور کرتی ہے لیکن قرآن پڑھتے ہی یہ گمشدہ کڑی مل جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اطمینان اللہ کے ساتھ بقیہ دونوں طاعتوں کو ایک ہی مد میں ڈال کر وادِ عطف سے ملا لیا جائے اور مفہوم یہ ہو کہ چونکہ رسول کو یہاں بطور صاحبِ امامت کے لیا گیا ہے اس لیے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کے مراد ایک ہی مرتبہ طاعت ہے، تو پھر اس مقام پر رسول کو رسول کہہ کر کیوں پیش کیا گیا اور مالک کیوں پیش کیا گیا، نہا اولی الامر کے الفاظ پورا پورا کام دے سکتے تھے۔ رسول تو اولی الامر کی صف میں از خود شمار ہوتا تھا۔ اس کی وجہ بیان کی جانی چاہیے جب رسول کا لفظ ترجمان ہی رسول اللہ کی حیثیت رسالت کا ہے تو اس لفظ کو حیثیتِ امامت کے لیے کیوں استعمال کیا گیا؟ حیثیتِ امامت کے لیے اور کوئی لفظ نہیں رہا تھا؟ ایجاد نہیں ہو سکتا تھا؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی فصاحت و بلاغت کی نشان دہی ہے کہ لفظ رسول کا بولتا ہے اور مراد لیتا ہے منصبِ امامت۔ اس پر ہم پوچھیں گے کہ اسی آیت میں دوبارہ جب معیار فیصد بیان کیا تو پھر اللہ اور رسول کے الفاظ استعمال کئے۔ اب یہاں یکا یک وہی رسول کا لفظ بالکل دوسرے معنی دینے لگا؟ کیا مرتبہ طاعت والے ٹکڑے اور معیار فیصلہ والے اس ٹکڑے میں کوئی ربط نہیں کہ ایک کو سمجھنے کے لیے دوسرے سے فائدہ اٹھایا جائے؟ آخر قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا مسلمہ قاعدہ بھی یہاں ہالائے طاق رکھ دیا جائے گا؟

آیت کی ساخت | اہل صورت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو مطلوب حقیقی کی حیثیت سے بیان کر کے بقی کا سارا ٹکڑہ بطور تفسیر دیا گیا ہے۔ یعنی دین و شریعت کا مرکزی تقاضا مسلمانوں سے یہی ہے کہ وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کریں لیکن اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ رسول کی (فی المعروف) اطاعت کریں اور اس کے تحت کار پر اوزانِ حکومت کی اطاعت بھی کریں۔ رسول کی اطاعت اس لیے کہ خدا کی اطاعت کرنے کے لیے عملی صورت یہی ہے کہ اس کے الٹا ناساندہ و ترجمان کا دامن تمام کے چلا جائے۔ اور اولی الامر کی طاعت اس لیے کہ بغیر اس کے اجتماعی نظام نہیں چل سکتا۔ اور یہاں معاملہ کسی صوفیانہ مذہبیت کا نہیں، ایک نظام تمدن و ہدایت کا ہے۔ پھر یہ آیت اپنی تقسیم مطالب کے ذریعے یہ بھی واضح کر رہی ہے کہ خدا وہ ہے کہ جس سے تم براہ راست اپنا دین نہیں لے سکتے، تمہیں براہ راست اگر واسطہ ہے تو ایک رسول سے ہے۔ دوسرے اولی الامر سے ہے۔

اولی الامر کو یہ آیت بالکل آخر میں جا ڈالتی ہے اور اوپر سے نیچے کی ترتیب کا تصور اگر پیش نظر رکھا جائے تو سب سے پہلے خدا تعالیٰ کا اقتدار سامنے آتا ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب، ناسنگی و ترجمانی، پھر ان کے تحت اولی الامر کا منصب اور انتظام! ان کڑیوں میں سے پہلی کو بلا دیجیے تو دین ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری کو ہٹا دیجیے تو دین کی عملی ہیئت تباہ ہو جاتی ہے۔ تیسری کو لغت رلو کر دیجیے تو اجتماعی نظام کا عمل مر جاتا ہے۔ اتنے مختصر الفاظ میں دنیا کا کوئی نظام، فکر بھی اجتماعی زندگی کے لیے نظام طاعت کو پیش نہ کر سکا ہوگا کہ ساری کی ساری کڑیاں بھی واضح ہو جائیں اور ان کی ترتیب بھی ذہن میں آجائے اور ہر کڑی کی مقصدی اہمیت بھی نمایاں رہے۔

یہ آیت ٹھیک اس کلمہ طیبہ کا ایک سیاسی و اجتماعی عکس پیش کرتی ہے جس کو قبول کر کے ایک آدمی مسلمان ہوتا ہے۔ "لا الہ الا اللہ" کہتے ہی "اطیعوا اللہ" کا تقاضا پیدا ہو جاتا ہے، اور محمد رسول اللہ کے کلمات زبان پر لاتے ہی "اطیعوا الرسول" کا مطالبہ ابھر آتا ہے۔ اور جب بھی اجتماعی زندگی کو کلمہ طیبہ کے مطابق استوار کرنے چلیے خود بخود "اولی الامر منکم" کی اطاعت کی ضرورت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

لازمہ ایمان | سورہ نسا میں یہ معرکہ آرا آیت ایک سخت امتیازی جملہ بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ فرمایا "ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر" یعنی تم لوگ اگر خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو تم کو خدا کی، رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرنی ہوگی، اور اس سلسلہ طاعت میں خدا و رسول کی تعلیم و توضیح کو معیار فیصلہ ماننا ہوگا۔ اشارہ مضمحل ہے کہ جو کوئی اس سلسلہ طاعت کو قبول نہ کرے اس کا خدا اور یوم آخر پر ایمان کھنسنے کا دعویٰ کھڑا کھلا دعویٰ ہوگا۔ پس یہ نظام طاعت جوں کا توں قبول کرنا لازمہ ایمان ہے، ان میں سے جو کڑی بھی کوئی توڑ دیتا ہے وہ ایمان گنوا بیٹھا ہے۔

فہم حق کی صحیح راہ | اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ ذلک خیر و احسن تاویل: یعنی احکام الہی کی تحقیق و توضیح کے لیے اور ان پر عمل پیرا ہونے اور ان پر ایک نظام زندگی چلانے کے لیے یہی سلسلہ طاعت بہترین صورت پیش کرتا ہے۔ تاویل کتاب یا تاویل احکام یا تاویل آیات کا صحیح طریقہ اس آیت نے متعین کر دیا۔ وہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر معاملہ پہلے خدا کے فرمان کو دیکھا جائے، پھر رسول سے اس کی تشریح اور اس کے بارے میں عملی نمونہ لیا جائے اور اس کے بعد اولی الامر نے اجتہاد کے دائرے میں جو عمل صورت ملے کی ہو اسے قبول کیا جائے "احسن تاویل" کی یہ راہ

چھوڑ کر اگر کوئی دوسری راہ اختیار کر لی جائے، اور بعض خدا کے احکام کو لے کر رسول کی تشریح اور نمونے کو اڑا دیا جائے، یا اولی الامر کے اجتہادی فیصلوں کو رد کر دیا جائے تو پھر ضلالت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی بہرہ کوشش باطل اور راہگاہاں ہے جس میں قرآن کو رسول سے الگ کر کے لیا گیا ہو اور جس میں اطاعتِ خدا کو اطاعتِ رسول سے مجرود کر لیا گیا ہو۔ اسی طرح جہاں کہیں اسلامی نظام کا فرما ہو وہاں خدا و رسول دونوں واجبِ اطاعت ماننے کے بعد اگر اولی الامر کے اجتہادی فیصلوں سے منہ موڑ کر اپنے لیے ایک الگ عمل راستہ نکالنے کی کوئی شخص سعی کرے اور معاشرہ کے اجتماعی اقدامات کا ساتھ دینے سے انکار کر دے تو اس کی قرآن فہمی اور اس کی تفسیر ذنا دہلی قرآن کو کوڑی کی قدر و قیمت بھی نہیں رکھتی۔ رسول کو درکنار رکھ کر قرآن کے کتنے ہی مسارف لکھ جائیے، کتنے ہی رسالے چھاپ ڈالیے، کتنی ہی دس دتدلیس کی مغفلیں جما بیٹھے اور ملاؤں کے خلاف دل کا کتنا ہی بجا زکا لیے، خود قرآن کی نگاہ میں یہ سب تیار پریشان ہے جو تھوڑی مہربانیا کو مکر کر کے گا اور پھر خود بخود ہوا ہو جائے گا۔

مزید توضیحات | سلسلہ کلام کا یہ کارواں ابھی اور آگے چلتا ہے اور ابھی استدلال کے کچھ اور موتی ہیں جو وحی الہی نے بکھیرے ہیں۔ اس آیت کے معاً بعد ان لوگوں کا ذکر چھڑ جانا ہے جن کا طرز عمل دین و سیاست کے اسلامی نظام میں موجبِ خلل ہو رہا تھا۔ یہ بظاہر غیر مسلم لوگ نہیں تھے بلکہ ان کی شان یہ تھی کہ "يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا نُزِّلَ إِلَيْكَ وَمَا أَنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" (نساء ۶۰) (یہ اپنی ہدایت پر ایمان رکھنے کے زعم کو دہرائیں لیے ہوئے تھے) لیکن دوسری طرف ان کی روش یہ تھی کہ "يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كِتَابَ اللَّهِ وَالطَّاعُونَ" (چاہتے تھے کہ اپنے مخالفانہ طے کرائیں تو طاعت سے کرائیں) وہ خدا ہی کے دین کے تحت رہ کر یہ چاہتے تھے کہ رسول کے منت کش نہ ہوں بلکہ آپ سے بالا بلا جس جس شیطان سے چاہیں حکم اور فیصلہ حاصل کرتے رہیں۔ متنبہ کیا گیا کہ ایسے لوگ جو خدا کے احکام میں سے من مانے فیصلے نکلوانے کے لیے رسول سے کترا کر دوسروں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ ضلالِ کبیر کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ گویا سماجی امت کے اولین منکرینِ حدیث و سنت تھے۔

ان لوگوں کو دعوت دی جاتی تھی کہ "تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَالْحَى الرَّسُولِ" (آؤ اللہ کے آنا سے جو ہے ضابطہ کی طرف، اور رسول کی طرف) پکارا صرف قرآن کی طرف نہیں، مطالبہ رسول کے آگے اپنے معاملات کو پیش کرنے کا ہے۔ دیکھیے یہاں وہی "اطيعوا الله واطيعوا الرسول" بول رہا ہے اور اس کی گونج سنائی دے رہی ہے لیکن

ان کا حال یہ تھا کہ "لَيَسْتَدُونَ عِنْدَكَ صُدُورًا" یعنی ان کے دل آنکھوں کے سامنے معاملات رکھنے کے معاملے میں بالکل بھینچ کر رہ جاتے ہیں اور قدم جیسے رک جاتے ہیں۔ خدا کے حکم سے فرار کرنے کا کوئی الزام نہیں دیا جا رہا، صرف رسول اللہ کی اتھارٹی تسلیم کرنے سے گریز کو واضح کیا جا رہا ہے، اور یہی چیز ہے جس پر ان کو نفاق کا مجرم قرار دے دیا گیا ہے۔

اور پھر — ان کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد ان کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نَبِيًّا ع
بِإِذْنِ اللَّهِ ع

اور، ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے، اسی صورت کے ساتھ
(اتھارٹی دے کر) بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن کے تحت

اس کی اطاعت کی جائے۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے، اس تحدی کو، اس حصر کو، اس زورِ کلام کو، اس جامعیت کو، اس قطعیت کو، اور لہجہ کی اس "ندی کو جس سے یہ فرمان صادر ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اوپر سے ساری بحث رسول کی اطاعت نہ کرنے پر ہی چل رہی تھی اور اس کو صاف کرنے کے لیے فیصلہ کن انداز میں بات ختم کی جا رہی ہے کہ ہم تو رسول بنا کر بھیجتے ہی ہمیشہ اس اتھارٹی کے ساتھ ہیں کہ لوگوں کو ان کی اطاعت کرنی ہوگی! اس سے کوئی استثنیٰ نہیں! صرف قرآن کو ماننے اور صرف خدا کی اطاعت من مانے طریق پر کرنے سے کام نہ چلے گا۔

ہمارے جدت طراز مفسرین کہیں گے کہ جی ہاں! رسول کی اطاعت فی الواقع ضروری ہے لیکن صرف رسول ہونے کی حیثیت کی حد تک، اور اس حیثیت میں رسول کے تقاضے ٹھیک وہی کچھ ہیں جو کچھ قرآن کے ہیں، پس قرآن کی اطاعت مطلوب ہے۔ یہ باتیں جدت کے لطائف کے لحاظ سے دلچسپ سہی، سوال تو یہ ہے کہ اوپر سے جو جھگڑا چلا آ رہا ہے اس کے پیش نظر ان الفاظ کا مدعا معلوم کیجیے۔ اوپر تو منافقین کی اس روش پر گرفت کی جا رہی ہے کہ وہ ظالم خدا اور اس کی کتاب سے انکار کئے بغیر رسول اللہ کے سامنے معاملات پیش کرنے سے اپنے آپ کو بالا تر رکھنا چاہتے تھے۔ اور اس موقع پر آپ ضرور فرمائیں گے کہ یہاں رسول کا منصب تصنا مراد ہے جو اسلامی ریاست کا ایک شعبہ ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام تھا۔ لیکن منصب تصنا پر بات ہوتے ہوتے یہاں کیسے آپنچی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی حقیقت انبیاء و رسل کے منصب کے بارے میں بیان کی کہ ہم رسول یونہی نہیں

بھیج دیتے کہ ان سے جو جیسا معاملہ چاہیے رکھے، بلکہ ہم انہیں ہمیشہ "مطاح" بنا کے بھیجتے ہیں۔ یا تو دونوں جگہ منصبِ فضا کو سامنے رکھیے یا دونوں مقامات پر منصبِ ربالت و نبوت کو! اور پھر بتائیے کہ کیا مفہوم ہاتھ آیا ہے مگر قرآن آپ کو یوں چھوڑنا کہاں ہے، یہ تو اہل زلیخ کو بڑے گھرتک پہنچا کے رکھتا ہے۔ آگے سنئے۔ ان منافقین کے بارے میں فرمایا کہ اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے، ظلم ڈھانے ہی تو را آپ کے پاس حاضر ہوتے اور۔ فاستغفر واللہ واستغفر لہم الرسول لوجدا اللہ تو اباً رحیماً (آیت ۶۴) یہ ان کو راہِ اصلاح بتائی، ان کو توبہ کا طریقہ بتایا۔ کیا؟ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کریں، اور رسول ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرے۔ دیکھیے وہی ترتیب، یعنی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے ایک جزیرے سے انحراف ان کا وہ گناہِ عظیم ہے جس کے بخشوانے کے لیے ان کو رسول اللہ کی خدمت میں شہابی کے ساتھ حاضر ہونا چاہیے، پھر خود خدا سے توبہ کرنی چاہیے اور دوسری طرف رسول کو راضی کرنا چاہیے تاکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کی معافی کے لیے دعا کرے! اب فرمائیے کہ اگر بندوں کا معاملہ رسول سے سروکار رکھے بغیر خدا سے براہِ راست ہونا اور ان کو اپنا دین اپنے خدا سے لے کر اپنا مسلک خود بنانا ہوتا اور اس دین سے فیصلہ از خود اخذ کرنا ہوتا تو وہ جب بھی مجرم ہوتے تو خدا ہی کے مجرم ہوتے اور خدا ہی سے مغفرت طلب کرنے پر معاملہ سب کرتا لیکن قرآن بتاتا ہے کہ جب وہ رسول کی نافرمانی کرتے ہیں یا اس کی اتھارٹی کو نظر انداز کرتے ہیں تو خدا اور رسول دونوں کے سامنے مجرم ٹھہرتے ہیں اور لازم ہو جاتا ہے کہ دونوں سے معاملات کو صاف کریں! دیکھیے یہاں بھی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے!

رسول آخری حکم ہے | معنوں کی اہمیت ایسی ہے کہ مغالطوں کا ایک ایک کاٹنا چہن کر نکال دینے کے لیے گفتگو اعدائے چلتی ہے، شکوک کو اور صاف کیا جاتا ہے، شہادت کا مزید ازالہ کرنا ملحوظ ہے۔ فتنہ کے دروازے بند کرنے کا اور بھی شدید انتہام کیا جاتا ہے۔ اب ہم ایک ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جو مذکورہ بالا آیت کی طرح رسول اللہ کی اتھارٹی کو متعین کرنے میں عدد و درجہ واضح اور اہم ہے۔ ملاحظہ ہو:

فَلَا دَرِيْفَ لَآ يَوْمَئِذٍ حَتَّىٰ يُحْكِمَ لَكُمْ فَيْمَا
 (سورۃ رسول خدا) تیرے آقا کی قسم کہ یہ لوگ ایمان
 کی دولت سے اس وقت تک مالا مال نہیں ہو سکتے جب تک کہ
 شَجْرَةً مِنْهُمْ (النساء - ۶۵)

تجھے اپنے معاملات میں حکم نہ بنالیں۔

وہی معیارِ فیصلہ جس کا اوپر بیان ہو چکا ہے، اسی کے ایک پہلو کو یہ آیت اور زور سے ابھار کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ معیارِ فیصلہ خدا اور رسول ہیں، لیکن چونکہ جس گروہ کے فساد و فتن پر بحیث ہو رہی ہے وہ خدا کی اتھارٹی ماننے میں کوئی اختلاف نہیں رکھتا تھا، اس لیے متفق علیہ پہلو کو بحث میں ساقط کر کے رسول کی اتھارٹی کے اس پہلو پر پورا زور دیا گیا جس میں اختلاف تھا۔ وہ لوگ قرآن کو لیتے تھے اور رسول کو درکنار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ رسول سے بگاڑ کر خدا سے براہ راست یاری گمانھنا چاہتے تھے۔ وہ تاج کے نمائندہ و ترجمان سے سرکشی کر کے سلطانِ حقیقی کی آنکھوں میں وقار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم رسول سے انقطاع کر کے بالابالا خدا سے واسطہ قائم رکھنے کی جو اتنی چال چل رہے ہو اس طرح تم ایمان سے بہرہ ورنہیں ہو سکتے۔ رسول کو حکم اور معیارِ فیصلہ نہیں مانو گے تو تمہارا قرآن کو ماننا جس اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے اور وہ تمہیں اہل ایمان کے دائرہ سے خارج کر کے کفار کی فہرست میں شامل کرے گا۔

اس مقام پر ایک تو لفظ **يُحْكِمُونَ** قابلِ غور ہے۔ **حَكَمَ** بِيْحَكْمِهِ حَكَمًا بِالْأَمْرِ وَاللَّحْجِ اِر۔ علیہ وبنیہم) کے معنی میں قضی و فصل، یعنی معاملے کو چکایا اور مختلف فیہ امر میں فیصلہ دیا، اس کا حق اس کے لیے متعین کر دیا اور اس کا حق اس کے لیے ایک فریق کی ذمہ داری اور دوسرے فریق کی ذمہ داری کو فیصلے کی ٹلیکریج کر الگ الگ کر دیا۔ فیصلہ دینے میں وہ قوت و اختیار شامل ہے جس کے تحت اس کو مانا جائے۔ اسی لیے اس طرز سے **أَحْكَمَهُ** جب کہیں گے تو مراد یہ ہوگی کہ اس نے اسے کسی طرف سے ٹوٹایا اور ٹوٹ گیا، اسے باز رکھا اور وہ باز آگیا۔ **أَحْكَمَ الْعُرْسَ** کہیں گے تو مطلب ہوگا کہ وضع علیہا **حَكْمَةٌ**، یعنی اس کی باجھوں کے اندر لگام کی رسی ڈالی۔ **أَحْكَمَهُ عَنِ** کہئے تو مدعا یہ ہوگا کہ اسے فلاں چیز سے روک دیا اور پھیر دیا۔ پھر اس مادے سے آتا ہے **حَكْمَةٌ** جو معنی دیتا ہے، **وَلَاةٌ** و **أَقَامَةٌ** حَاكِمًا یعنی اسے اختیارات سونپے یا حاکم بنایا، **حَكْمَةٌ** فی الامر کے معنی ہوں گے، **فَوَعِنَ إِلَيْهِ الْحَكْمَ فِيهِ**، یعنی کسی معاملے میں فیصلہ دینے کا اختیار اس کے حوالے کر دیا **حَكْمَةٌ عَنِ** لہذا کا ترجمہ ہوگا: **الْوَجْعَةُ** و **مَنْعَةٌ**، یعنی اسے کسی چیز سے ہٹایا اور باز رکھا۔ **الْحَكْمَ** کہتے ہیں **مَنْعًا** الْحَكْمَ، یعنی وہ شخص یا ادارہ جس کی اتھارٹی سے فیصلہ صادر اور نافذ ہو۔

اس مختصر نفی و وضاحت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حَکْمٌ یُحْکَمُ کا مادہ ایک اتھارٹی کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ اتھارٹی ایسی ہے کہ جس کا حامل مختلف فیہ امر میں فریقین کو فیصلہ دیتا ہے، وہ حق اور باطل، جائز اور ناجائز کو تقسیم کرتا ہے۔ وہ دونوں کے حقوق اور دونوں کی ذمہ داریوں میں خطِ فاصل کھینچتا ہے۔ وہ ہر فریق کو کسی چیز سے ہٹانے پھیرنے اور باز رکھنے کا سزاوار ہے۔ حَکْمٌ یُحْکَمُ کا مطلب یہ ہوا کہ کسی کے لیے اس اتھارٹی کو اپنی رضا سے تسلیم کر کے اپنے معاملاتِ نراسمی کو اس کے سامنے رکھنا اس میں یہ بات از خود شامل ہے کہ سرتابی کا حق اپنے لیے ختم کر لیا گیا ہو۔

یہ پوزیشن ہے جو قرآن نے رسول اللہ صلعم کو نظامِ دین میں عطا کی ہے۔ یعنی آپ کو اللہ تعالیٰ نے تو لوگوں کے معاملات میں حُکْمِ عظیم ایا ہی ہے، لیکن مطلوب یہ ہے کہ مسلمان بہ طوع و رغبت آنحضرت کی اس اتھارٹی کو تسلیم کریں۔ محض سیاہی دباؤ سے یہ حیثیت تسلیم کر کے چاروناچار آپ سے فیصلے لینا اور بادلِ ناخواستہ ان کو ماننا ایمان کے بہرہ ور نہیں کر سکتا۔ یہ صورت تو صرف آدمی کو اسلام کے سیاہی نظام میں ظاہری حیثیت سے مسلم کا درجہ دلا سکتی ہے، لیکن دینی حیثیت سے عند اللہ آدمی کا مومن ہونا تقاضا کرتا ہے کہ آنحضرت کو طوع و رغبت سے فیصلہ کن اتھارٹی ماننا چاہئے۔ (باقی)



سلاجقہ

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی



دولتِ عباسیہ کے سیاہی زوال کے بعد جس سلطنت نے ممالکِ اسلامیہ کے بیشتر حصہ کو ایک مرکز پر جمع کیا اور مسلمانوں

سیاہی انتشار اور پراگندگی سے نکال کر دنیا کے سامنے عام انسانی کارنامہ اعلام بن کر آخری مرتبہ پیش کیا وہ سلجوق سلطنت تھی اس کے

کارنامے مولانا کی اس تاریخی کتاب میں ملاحظہ کیجیے۔ قیمت: ۳/۸

مسول ایجنٹ: طاہر رسول قادری، ۸۱ پیرغازی روڈ، لاہور • مرکزی مکتبہ جماعتی سلاخ پاکستان
اور اپنے شہر کے کتب فروشوں سے طلب فرمائیں۔